دلائل السنن و الآثار

(۸)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

درایت احادیث کی صحت کو جانچنے اور احادیث کی صحیح پیروی کرنے کے لیے روایت کے ساتھ درایت بھی ضروری ہے۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم ایک عام غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتے ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ درایت سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص حدیث کے مضمون کو اپنی عقل کے معیار پر جانچے، اور جب حدیث میں کوئی بات اسے اپنی عقل کے خلاف نظر آئے اُسے بے تکلف رد کر دے۔ درایت کا یہ مفہوم بالکل غلط ہے۔ ہر معاملہ میں ہر شخص کی عقل کو معیار ماننا بالکل مضحکہ خیز بات ہے۔ جن لوگوں نے عقلی تحقیقات میں عمریں گنوا دیں وہ بھی کسی ایک عقلی نظریہ پر متفق نہ ہو سکے۔ فیثاغورس نے ایک زمانہ میں زورِ تقریر اور قوت استدلال سے تمام دنیا کو نظام شمسی کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد بطلیموس آیا تو اس نے اس کے تمام نظام کو الٹ پلٹ کر دیا اور اپنی بات منوالی۔ اب یورپ نے بطلیموس کے تمام خیالات کو باطل کر دیا اور فیثاغورس کے نظام کو حق سمجھ کر قبول کر لیا۔ تو کیا اس عقل کو جو خود ایک بات پر نہیں جمتی اور نہیں جم سکتی، جملہ امور میں معیارِ حق قرار دیا جا سکتا ہے؟ کل جب دنیا میں بطلیموسی نظام کو محکم سمجھا جاتا تھا، بہت سے لوگ حدیث اور قرآن میں اس نظام کے خلاف کوئی بات دیکھ کر پکار اٹھتے تھے کہ یہ تو خلافِ عقل ہے۔ مگر علم کی ترقی نے بالآخر ثابت کر دیا کہ وہ ان کا قصورِ عقل تھا۔ اسی طرح آج جو لوگ اپنے زمانہ کے نظریات

کی بنا پر قرآن و حدیث کی بعض چیزوں کو خلاف عقل قرار دینے کی جرأت کرتے ہیں، ان کا قصورِ عقل بھی آگے چل کر خود واضح ہو جائیگا۔ یہ تو ہماری عقل کا حال عالم شہادت کے معاملات میں ہے۔ پھر بھلا امور غیب میں اسے کس طرح آخری حکم بنایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے حکمار اسلام فرماتے ہیں کہ "بلا شبہ عقل ایک میزان صحیح ہے اور اسکے احکام یقینی ہیں، لیکن یہ کہ اس میں توحید اور آخرت کے امور اور نبوت کی حقیقت اور صفات الٰہیہ کو تولا جائے، محالات کی آرزو کرنا ہے" (العقل و النقل) مشہور مورخ علامہ ابن خلدون نے کہا ہے کہ "یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہے بلکہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں کہ اب تک ہم پر منکشف نہیں ہوئیں۔" اسی بنا پر امام ربانی مجدد الف ثانی کو بھی اپنے مکتوبات میں لکھنا پڑا کہ

> طور عقل وراء طور حس است کہ آنچہ بہ حس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہم چنیں طور
> نبوت وراء طور عقل است، آنچہ بہ عقل مدرک نشود بہ توسل نبوت درک می آید۔ ہر کہ وراء طور
> عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوت و مصادم بداہت است"

یعنی عقل کی راہ .... حواس کی راہ سے جدا ہے۔ جو چیز حواس سے محسوس نہیں ہوتی وہ عقل سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علٰحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کر سکتے اس کو نبوت کے توسط سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقِ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوت کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے[1]"

غور کا مقام ہے کہ جب خود عقل ہی سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں ہماری عقل کی رسائی سے بالاتر ہیں تو یہ سعی لاحاصل کرنا کہ ہر شئے کو عقل ہی سے سمجھا جائے حقائق کا انکار کرنا ہے عقل اسکا نام نہیں ہے کہ ہر چیز میں ہر شخص بلا سمجھے بوجھے مداخلت شروع کر دے اور جسکا جو دل چاہے کہنے لگے، بلکہ عقل کا مقصد یہ ہے کہ جس علم یا جس فن میں کسی کو کمال حاصل ہو اسکی بات اس علم کے متعلق

---

[1] العقل والنقل،

قبول کی جائے۔ بعض احادیث صحیحہ جو بظاہر عقل انسانی پر منطبق نہیں ہوتیں ان کی دو ہی وجہیں سمجھ میں آتی ہیں (۱) نقصان نقل (۲) نقصان عقل۔ نقصان نقل یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے وہ دیگر تاریخی بیانات کے مخالف ہو یا کسی دوسری صحیح تر سند سے اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت ہو جو اسکی تکذیب کرتی ہو، یا راوی سے مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو، یا راوی نے کوئی ادھوری بات نقل کر دی ہو، یا اسلام کے کسی مسلمہ اصول کے خلاف ہو، یا صریح نص قرآنی کے معارض ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اور نقصان عقل یہ ہے کہ بات بجائے خود صحیح ہو مگر ہماری عقل اسے پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہو، یا ہمارے علم نے ابھی اتنی ترقی نہ کی ہو کہ اسکی کنہ تک پہنچ سکیں۔ پہلی صورت میں کافی تحقیق کے بعد حدیث کو رد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں حدیث پر مخالفانہ کلام سے پرہیز کرنا واجب ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام نے عقل کا جسقدر لحاظ رکھا ہے شاید ہی کسی مذہب نے اس کا اتنا احترام کیا ہو۔ اسلام کا تو اپیل ہی تمام تر انسان کی عقل سلیم سے ہے۔ وہ بار بار انسان کو مشاہدہ اور غور و فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور اپنے احکام کی تعمیل کے لیے بھی سمجھ بوجھ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن پڑھو، اس کے صفحات اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، یَتَفَكَّرُوْنَ، یَتَذَكَّرُوْنَ، یَنْظُرُوْنَ وغیرہ الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عقل کی دنیا تنگ اور اسکی پرواز محدود ہے۔ عالم شہادت کی چیزوں کو تو عقل تھوڑا یا بہت جان سکتی ہے، مگر عالم ملکوت کی اشیاء اسکی بساط سے خارج ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی گتھیوں میں سے آج تک کسی گتھی کو بھی انسان اپنی عقل سے نہیں سلجھا سکا۔ لہٰذا انسان کے لیے عقلمندی یہی ہے کہ وہ اپنی عقل کی حدود کو پہچانے، اور جو چیزیں اسکے فہم و ادراک سے ماوراء ہوں ان میں ایسے قطعی احکام لگانے سے پرہیز کرے کہ "فلاں بات عقل کے خلاف ہے لہذا غلط ہے" اور "فلاں بات میری سمجھ میں نہیں آتی لہٰذا اسکی کوئی حقیقت نہیں"۔ اسی لیے قرآن مجید نصیحت کرتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ - جس بات کا تمہیں علم نہیں اسکے پیچھے نہ پڑو۔

تعریف درایت اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ احادیث میں جو مابعد الطبیعی مسائل (یا بالفاظ دیگر جو امور غیب) بیان ہوئے ہیں ان کو اپنی محدود عقل سے جانچنا اور محض عقلی فیصلہ کی بنا پر قوی سے قوی سند رکھنے والی حدیثوں کو غلط کہدینا، درایت نہیں ہے، اور لفظ درایت کا یہ غلط مفہوم جو آج کل عموماً دماغوں میں پیدا ہوگیا ہے، محض جہالت کا نتیجہ ہے۔

اصل میں درایت کے معنی ہیں سمجھ بوجھ کے۔ درٰی یدری درایۃً لغت میں جاننے، سمجھنے اور واقف ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن میں بھی یہ لفظ جگہ جگہ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ اور فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا هِيَةْ وغیرہ۔ پس کسی بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور ظاہری مواد کے اندر حقیقت کو ٹٹولنا درایت ہے۔ آپ کے سامنے جب کوئی شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں جگہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے تو اس روایت کو سُن کر آپ کا ذہن دو طرح پر کام کرتا ہے۔ پہلے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اطلاع دینے والا قابل اعتبار بھی ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس نے خود اس واقعہ کو دیکھا ہے یا دوسروں سے سنا ہے، اور اگر دوسروں سے سنا ہے تو آیا وہ راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں، اور روایت کا یہ سلسلہ کسی معتبر عینی شاہد تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ یہ جستجو اور تحقیق کا ایک سلسلہ ہے جس کو مجموعی طور پر آپ تحقیقِ روایت کا نام دے سکتے ہیں۔ اسکے بعد آپ کا ذہن دوسری طرح پر کام شروع کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ واقعہ بجائے خود کس نوعیت کا ہے معمولی ہے یا غیر معمولی۔ اگر غیر معمولی ہے تو آیا شہادت اتنی وزنی ہے کہ ایسی شہادت پر ایسے ایک غیر معمولی واقعہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ پھر اس سلسلہ میں جو دوسری مستند معلومات میرے پاس موجود ہیں، یہ واقعہ ان کے خلاف ہے یا موافق۔ اور یہ کہ جن حالات میں اس واقعہ کا صدور بیان کیا جاتا ہے ان میں یہ پیش بھی آسکتا تھا یا نہیں۔ اس دوسری

قسم کی تحقیقات کا نام درایت ہے۔ عدالت میں ہر جج ، ہر مقدمہ میں تحقیق کے ان دونوں طریقوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ گواہوں کے بیانات کو پہلے قانون شہادت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ پھر انکی گواہی پر خود اپنی درایت کو استعمال کر کے رائے قائم کرتا ہے کہ جو اطلاع انکے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے وہ کس پایہ کی ہے ، کہاں تک قابلِ قبول ہے اور اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

حدیث میں بھی درایت کے استعمال کی نوعیت یہی کچھ ہے۔ جس طرح شہادت کو جانچنا اور رائے قائم کرنا ہر راہ چلتے کا کام نہیں ہے ، بلکہ اسکے لیے ایک ماہر فن جج کا علم اور تجربہ درکار ہے ، اسی طرح احادیث میں بھی درایت سے کام لینا کالج کے ہر صاحبزادے کا کام نہیں ہے ، بلکہ اس کا اہل صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے پوری واقفیت ہو ، اس بارے میں جتنی روایات صحیحہ ہیں وہ اس کے پیش نظر ہوں ، آنحضرت صلعم کے زمانہ کے واقعات اور حالات پر عبور رکھتا ہو ، قرآن سے خوب واقف ہو ، دین کے نظام کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہو ، اور جس نے مدۃ العمر کے مطالعہ ، غور و خوض اور تحقیق و تفتیش سے اتنی بصیرت بہم پہنچائی ہو کہ کسی حدیث کو سن کر اسکی سند پر نظر کیے بغیر وہ ایک حد تک وثوق کے ساتھ کہہ سکے کہ یہ حدیث آنحضرت کی ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ ملا علی قاری موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں :۔

ابن قیم جوزی سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث	وقد سئل ابن قيم الجوزيه
موضوع کو سند پر نظر کیے بغیر پہچان لیا جائے ، یعنی کیا	هل يمكن معرفة الحديث الموضوع
سند کے سوا موضوع حدیث کو جانچنے کے لیے کوئی اور کسوٹی	بضابط من غير ان ينظر في سنده فقال
بھی ہے ؟ ابن قیم نے جواب دیا یہ بڑا اہم سوال ہے۔	هذا سوال عظيم القدر وانما يعرف
یہ پہچان صرف اس شخص کو ہو سکتی ہے جس نے احادیث کی	ذلك من تطلع في معرفة السنن
چھان بین میں ایک عمر گزار دی ہو حتی کہ حدیث کا علم	الصحيحة وخلطت بلحمه ودمه وصار له

فيها ملكة واختصاص شديد بمعرفة السنن والآثار ومعرفة سيرة الرسول عليه الصلوة والسلام وهديه فيما يامر به وينهى عنه ويخبر عنه ويدعوا اليه ويحبه ويكرهه ويشرعه للامة بحيث كانه مخالطه عليه الصلوة والسلام بين اصحابه الكرام فمثل هذا يعرف من احواله وهديه وكلامه واقواله وافعاله

اس کے خون اور گوشت میں اتر گیا ہو اور اس علم میں اسے خاص ملکہ حاصل ہو گیا ہو، اور اس نے سیرت نبوی اور سنن و آثار سے گہری واقفیت بہم پہنچائی ہو اور وہ آپ کی ہدایت کو خوب جان گیا ہو کہ آپ کس چیز کا حکم دیتے تھے اور کس سے منع کرتے تھے، کس بات کی خبر دیتے تھے اور کس چیز کی طرف دعوت دیتے تھے، کیا بات آپکو پسند تھی، کس بات کو آپ برا سمجھتے تھے، اور کن طریقوں کو اپنی امت کے لیے مقرر فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص ان امور کو جاننے میں اس حد کو پہنچ جائے کہ گویا وہ حضور کے ساتھ آپ کے مصاحبوں میں شامل ہے تو وہ بلا سند پہچان لیگا کہ کیا چیز آپ کے احوال اور آپ کی ہدایت سے تعلق رکھتی ہے، اور کونسا کلام آپکا ہے، اور کس قول یا فعل کی نسبت آپکی طرف ہو سکتی ہے[1]

حضرت امام شافعی کا یہ قول بھی اسی معنی میں ہے کہ ”جس نے حدیث میں نظر پیدا کر لی اس کی حجت قوی ہو گئی“[2]

صاحب مفتاح السعادۃ درایت کی تعریف میں رقمطراز ہیں، ھو علم يبحث فيه عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث وعن المعنى المراد منها مبنياً على قواعد العربية وضوابط الشريعة مطابقا لاصول النبي صلى الله عليه وسلم[3] - یعنی ”درایت وہ علم ہے جس میں حدیث کے معنی و مفہوم کا کھوج لگایا جاتا ہے کہ زبان عربی کے قواعد اور شریعت کے ضوابط اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول کے مطابق الفاظ حدیث سے حقیقی مراد کیا ہے“

---

[1] مقدمہ اصح السیر،
[2] تذکرۃ السامع -
[3] تعلیقات تذکرۃ السامع

امام ربیع ابن خیثم درایت کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ ان للحدیث ضوءً کضوء النہار تعرفہ وظلمۃ کظلمۃ اللیل تنکرہ[1] یعنی "حدیث میں ایک روشنی ہوتی ہے دن کی روشنی جیسی، اور ایک تاریکی ہوتی ہے رات کے اندھیرے کی طرح۔ اسی روشنی اور تاریکی میں تمیز کرنا درایت ہے"

یہی وہ درایت ہے جسکی بنا پر علامہ ابن قیم نے بعض روایتوں کے متعلق صاف صاف کہہ دیا کہ "اگر ایسی روایتوں کی اسناد آفتاب کی طرح ہوں تب بھی وہ غلط محض اور وہم ہوں گی"

پس درحقیقت حدیث میں درایت سے کام لینا صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جن کو احادیث رسول اللہ اور سیرۃ نبویہ پر کامل عبور اور ملکۂ راسخہ حاصل ہو گیا ہو اور جنکی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہو اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو خوب پہچان گئے ہوں۔ ایسے لوگ حدیث کے الفاظ اور طرز کلام اور دوسرے قرائن کو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ آنحضرت کا کلام ہے یا کسی اور کا۔ ایک مشاق انشا پرداز، ایک کہنہ مشق شاعر، ایک حاذق طبیب، ایک تجربہ کار جوہری، ایک ماہر سنار جسطرح کلام کی بندش، مریض کی حالت، ہیرے کی جوت اور سونے کے عیار کو بیک نظر دیکھ کر ماہرانہ رائے دے سکتا ہے، اسی طرح ایک تجربہ کار اور وسیع النظر محدث اور فقیہ بھی احادیث کے متعلق اپنی درایت و بصیرت سے رائے قائم کر سکتا ہے۔ مگر اسکے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا کہ اسے سیکھ کر ہر شخص پرکھنے پر قادر ہو جائے۔ قادر تو وہی ہوگا جو مشق و مزاولت سے اسی طرح کا ملکہ پیدا کرے۔ ایسا شخص بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اسلیے کہ اسکی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی سی جوت دیکھ لیتی ہے، اور اسکی روح روح محمدی میں گم اور اسکی نظر بصیرۃ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام درایت ہے۔

تاریخ اور حدیث کا فرق اس دور تحقیق میں جہاں اور بہت سی غلط فہمیاں اور خام خیالیاں احادیث

نبوی کے متعلق پیدا کی جارہی ہیں، وہاں ایک یہ بھی عجیب خیال ہے کہ حدیث کی قدر و قیمت محض تاریخ ہونے کی حیثیت سے ہے، رہے دینی احکام تو انکی بنیاد حدیث پر رکھنا درست نہیں۔ اس خیال کی تائید میں جو دلیل بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ "حدیث کا اعتماد رواۃ کے اعتماد پر قائم ہے اور رواۃ کا اعتماد ان کے معاصرین کی شہادت پر مبنی ہے جو بالکل ایک تاریخی چیز ہے، اس لیے اس تاریخی چیز پر بجز تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہو سکتی"۔ میرے نزدیک اس استدلال اور استنتاج میں تحقیق کم، اور خوش فہمی کا دخل بہت زیادہ ہے۔ اگر اس دعوے کے پیش کرنے والوں نے کچھ تحقیق سے کام لیا ہوتا تو وہ اتنی کھوکھلی اور بے اصل بات نہ کہتے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت از روئے قرآن اور از روئے اعتقاد کیا ہے اور ابتدا سے کیا رہی ہے؟ کیا وہ حضورؐ کو محض زمانۂ گذشتہ کا ایک لیڈر سمجھتے ہیں جس طرح اور دوسرے لیڈر پہلے گذر چکے ہیں؟ کیا آپ کا عہد انکی نگاہ میں محض ایک پچھلے زمانہ کا تاریخی عہد ہے؟ کیا ان کا تعلق اس عہد سے بس اتنا ہے جتنا اموی، اور عباسی، اور سلجوقی عہد سے ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگی سے مسلمانوں کی دلچسپی بس اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی دلچسپی وہ ہارون و مامون اور نظام الملک طوسی وغیرہ تاریخی شخصیتوں کے ساتھ رکھتے ہیں؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو اس کو اپنے ایمان بالرسالت پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اگر وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضور اکرم اور آپ کے دور کی حیثیت ہمارے لیے محض تاریخی نہیں ہے، بلکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپ کی سیرت کا ایک ایک جزء ہمارے لیے نمونۂ تقلید ہے، اور ہم کو اسلام کے راستہ پر چلنا ہی آپ کے طریق زندگی سے معلوم ہوتا ہے، اور ہمارے لیے اپنے دین کو پوری طرح سمجھنا ہی ناممکن ہے جب تک کہ ہم اس عہد کے حالات سے واقف نہ ہوں جس میں قرآن نازل ہوا اور قرآنی تعلیمات کا عملاً مظاہرہ کیا گیا، تو اس حقیقت

کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی یہ بات تسلیم کر لینا آپ سے آپ لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی اور آپ کے عہد کے حالات ہمارے لیے تاریخی نہیں بلکہ دینی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر کسی قدیم عہد یا کسی گذری ہوئی شخصیت کے متعلق کچھ ثابت ہو جائے تو اس سے ہم پر کوئی چیز لازم نہیں آتی۔ لیکن آنحضرت صلعم اور آپ کے دور کے متعلق کوئی چیز ثابت ہو جائے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اسکی پیروی کریں، اس کو حق سمجھیں اور اس پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھیں۔ اسی طرح کسی دوسری شخصیت یا عہد کے متعلق کوئی غلط چیز مشہور ہو اور وہ تاریخ سے ثابت نہ ہو تو اس سے ہماری زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، لیکن سیرت نبوی یا دور نبوی کے متعلق کوئی غلط بات مشہور ہو جائے تو اس سے ہمارے دین پر حرف آتا ہے، ہماری زندگی کی اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی بنیادوں پر اثر پڑتا ہے اور ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اسکی تردید کر کے اس کے برے اثرات کو محو کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے سیرت نبوی اور سیر صحابہ اور عہد رسالت کے حالات کی چھان بین اور تحقیق کے ساتھ وہ اعتناء کیا جو آج تک کسی تاریخی شخصیت اور کسی تاریخی دور کے حالات کی تحقیق سے دنیا کی کسی قوم نے نہیں کیا۔ کیا کہیں دنیا میں اسکی مثال ملتی ہے کہ کسی انسان کے رہنے سہنے اور اسکے خانگی معاملات اور اسکی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز کا اس طرح کھوج لگایا گیا ہو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا لگایا گیا؟ کیا کہیں اسکی مثال ملتی ہے کہ لوگ سینکڑوں اور ہزاروں میل سفر کر کے یہ معلوم کرنے جائیں کہ ایک شخص جو اُن سے پہلے گذر چکا ہے وہ کس طرح وضو کرتا تھا، کیوں کر نماز پڑھتا تھا، کیا کھاتا تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کیسے رہتا تھا؟ اور کیا اسکی کوئی مثال دنیا میں ملتی ہے کہ لوگ کسی پچھلے زمانہ کے انسان کی زندگی کے حالات سندوں کے ساتھ نوٹ کریں، اور ایک ایک واقعہ کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ معلوم کریں کہ اس واقعہ کو کس نے کس سے سنا؟ اور کیا کہیں اسکی مثال بھی ملتی ہے کہ جن

لوگوں نے اس شخص کے حالات بیان کیے ہوں خود ان کے حالات کی بھی تحقیق کر ڈالی جائے کہ وہ سچے تھے یا جھوٹے اور ان کا حافظہ درست تھا یا نہ تھا اور وہ ذمہ دارانہ طریقہ پر روایات نقل کرتے تھے یا غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ پوری انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اب غور کرو کہ آخر اُسی ایک ذات اور اسی ایک دور کے معاملہ میں یہ نرالا اور انوکھا طرزِ تحقیق کیوں اختیار کیا گیا؟ کیا یہ تابعین و تبع تابعین اور بعد کے محدثین دیوانے تھے کہ ایک ایسی چیز کی تحقیق و تفتیش میں انہوں نے اتنا سر کھپایا جس کی کوئی قدر و قیمت تاریخی حیثیت سے بڑھ کر نہ تھی؟ اگر وہ ذات محض ایک تاریخی شخصیت ہوتی تو جس طریقہ پر آج ایک شخص سکندر اور تیمور اور نپولین کے حالات لکھ دیتا ہے اسی طرح وہ لوگ بھی لکھ دیتے۔ انہیں آخر کیا بیماری ہوئی تھی کہ محض تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے اور ایک ایک شخص سے پوچھتے پھرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فلاں واقعہ تم نے کس سے سنا تھا اور اس نے کس سے سنا تھا، اور دوسرے کن کن لوگوں نے اس واقعہ کی خبر کس کس سے پائی ہے، اور جن جن لوگوں نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہیں؟

جن لوگوں کو اللہ نے عقل دی ہے، اور جو ایمانداری کے ساتھ حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ اگر ان امور پر غور کریں گے تو ان کا دل گواہی دیگا کہ یہ سارا کام جو کیا گیا ہے، محض تاریخ نگاری کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اُس انسانِ اعظم کا طرزِ زندگی اور طریق عمل معلوم کرنے کی ضرورت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بھیجا تھا کہ لوگوں کو مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھائے۔

تم چاہو تو اس کو "تاریخ" کے نام سے موسوم کر لو۔ مگر یاد رکھو کہ یہ تیمور یا نپولین کی تاریخ نہیں ہے بلکہ خدا کے نبی کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ سے جو کچھ ثابت ہو جائے اس کی پیروی کرنا ایک مسلمان پر لازم

ہو جاتا ہے۔ اور اس تاریخ سے جو بات غلط ثابت ہو اسے مٹا دینا ہر مسلمان کے لیے فرض و واجب ہے۔ اس تاریخ کا اور دوسری تاریخوں کا یہ اصولی فرق اگر تم کو تسلیم ہے تو تمہیں اختیار ہے کہ اسے حدیث یا سنت کے بجائے "تاریخ" کے نام سے یاد کرو محض الفاظ اور اسماء میں جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رہا یہ خیال کہ روایات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اسکا ثبوت ویسا ہی ظنی ہوتا ہے جیسا تاریخی واقعات کا ثبوت ظنی ہوا کرتا ہے، تو یہ بات تحقیق کے خلاف ہے دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جسکی سند اس طرح تسلسل کے ساتھ عینی شاہدوں تک پہنچتی ہو جس طرح حدیث میں پہنچتی ہے، اور نہ دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کے متعلق ایسے ذرائع تحقیق کہیں موجود ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق تحقیق کے ذرائع موجود ہیں۔ لہذا احدیث کی روایات کو عام تاریخی روایات کی سی حیثیت دینا محض ایک جاہلانہ بات ہے۔ البتہ یہ بات ضرور صحیح ہے کہ اخبار احاد سے کسی امر کا جو ثبوت بہم پہنچتا ہے وہ ظنی ثبوت ہے، لیکن ہم اس سے پہلے قرآن سے ثابت کر چکے ہیں کہ جس نوعیت کا ظن غالب مستند روایات سے حاصل ہوتا ہے اسکی پیروی کرنا نہ صرف درست ہے، بلکہ اسکی پیروی نہ کرنا مذموم ہے۔ لہٰذا وہ لوگ غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ دین میں صرف یقینیات کی جگہ ہے اور ظنیات سب کے سب بلا استثناء دین سے خارج کر دیے جانے چاہییں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک عقائد سے متعلق ہے جن پر آدمی کے مسلمان یا کافر ہونے کا مدار ہے۔ اور دوسرا حصہ احکام شرعیہ سے متعلق ہے جن پر کفر و اسلام کا مدار نہیں ہے۔ یقینیات کی ضرورت صرف پہلے حصہ کے لیے ہے رہا دوسرا حصہ تو اس میں ظن غالب کی پیروی کی جا سکتی ہے اور نہ صرف کی جا سکتی ہے، بلکہ اسکے بغیر چارہ نہیں۔ اس بات کو آپ ایک سیدھی سی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے اور آپ کی طرف سے ایک شخص یمن کی حکومت پر

ماموررہے ۔ حضور اس شخص کے پاس ایک قاصد کے ذریعہ سے حکم بھیجتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزوں کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اور اتنی مقدار سے کم مال چرانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے ۔ اب غور کیجیے کہ اس شخص کو کیا کرنا چاہیے؟ حکم صرف ایک آدمی لایا ہے ۔ اس کے بیان اور جملہ قرائن پر نظر کرنے سے اس امر کا ظن غالب تو حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ حضور کا قاصد ہے اور جو کچھ بیان کر رہا ہے، وہ حضور کی طرف سے ہے، لیکن ایسا علم اس ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتا جس پر علم یقین کا اطلاق ہو سکے ۔ اب کیا اس عامل کے لیے یہ درست ہوگا کہ ظن غالب کی پیروی سے انکار کر دے اور کہدے کہ جب تک ہزار آدمی میرے پاس متواتر خبر لے کر نہ آئینگے میں ہر چیز کی چوری پر لوگوں کے ہاتھ کاٹتا رہونگا؟

اس مثال پر جو لوگ انصاف کے ساتھ غور کرینگے وہ بآسانی اس بات کو سمجھ لینگے کہ پہلے تو حدیث کو تاریخ کے درجہ تک گرانا، اور پھر یہ کہنا کہ تاریخی طور پر جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ محض ظنی ہوتی ہے اور کوئی ظنی چیز دین کے کسی شعبہ میں بھی جگہ نہیں پا سکتی، یہ سراسر ایک جاہلانہ طرز استدلال ہے، اور اس میں صرف جہالت ہی نہیں بلکہ حماقت اور بلادت ذہن بھی کار فرما ہے ۔

حدیث کی اشاعت کے لیے صحابہ کا اہتمام حدیث کی یہی شرعی نہ کہ تاریخی حیثیت تھی جس کی وجہ سے صحابہؓ کرام اور خود خلفائے راشدین نے اس کی اشاعت کا بطور خاص اہتمام کیا، اور صحابہ و تابعین کے دور میں مسلمانوں نے اس علم کو حاصل کرنے کی طرف غیر معمولی توجہ کی ۔ ذیل کے مستند واقعات پر نگاہ ڈالیے اور غور کیجیے کہ کیا محض تاریخی معلومات کو پھیلانے کے لیے بھی کبھی وہ اہتمام کیا جا سکتا تھا جو حدیث کی اشاعت کے لیے کیا گیا ہے؟

(۱) حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں بہت سی احادیث کو لفظ بلفظ نقل کرا کے اضلاع کے حکام کے پاس بھیجا۔ یہ احادیث اکثر شرعی مسائل اور احکام سے متعلق تھیں ۔

(۲) صحابہ میں جو لوگ فن حدیث کے ارکان تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے بھیجا گیا چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، "فاروق اعظم بسیارے از امہات فن حدیث روایت کردہ است و در دست مردم تاہنوز باقی است، بعد ازاں فاروق اعظم علماء صحابہ را باقلیم دار الاسلام رواں ساخت و امر کرد باقامت شہرہا و بروایت حدیث در آنجا۔"[1]

(۳) حضرت ابوذر غفاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو لوگوں تک پہنچانا اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ بخاری میں ان کا یہ مقولہ موجود ہے کہ "اگر تم میرے قتل کے لیے میری گردن پر تلوار رکھ دو اور مجھے یہ امید ہو کہ مرنے سے پہلے رسول اللہ صلعم کا ایک کلمہ بھی جو میں نے سنا ہے پہنچا سکونگا تو میں ضرور کہدونگا۔"[2]

(۴) حضرت ابوسعید خدری کے حالات میں لکھا ہے کہ جب وہ حدیث روایت کرتے تھے تو آدمیوں کی دیوار سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔

(۵) بعض صحابہ آدمیوں کے ہجوم کی وجہ سے مکانوں کی چھت پر چڑھ کر حدیث روایت کرتے تھے،

(۶) حضرت امیر معاویہ، شام سے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد تمہیں معلوم ہو تو مجھے لکھ بھیجو۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عباس جو نبی صلعم کے زمانہ میں کم سن تھے بعض بڑی عمر کے صحابہ کے دروازہ پر صبح سے دوپہر تک صرف اس غرض سے بیٹھے رہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی کوئی بات بیان کریں تو یہ اسے نوٹ کرلیں۔[3]

(۸) علامہ ذہبی حضرت ابودرداء صحابی کے حالات میں ایک تابعی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں

---

[1] ازالۃ الخفاء۔ [2] بخاری شریف۔ [3] دارمی

کہ میں نے ابو درداءؓ کو دیکھا کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تو ان کے ساتھ اتنے لوگ ہوتے تھے جیسے کسی بادشاہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پوچھ رہے تھے۔[1]

(۹) امام زہری نے حدیث و روایت کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان، بڈھے، عورت، مرد جو ملجاتا حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں تک سے جاکر آنحضرت صلعم کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے۔ ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو بقول علامہ ذہبیؒ صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں[2]، باقی حالات آپ کے اوپر گذر چکے ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ [2] مقدمہ سیرۃ النبی۔ بعض خوش فہم لوگوں نے امام زہری کو بنو امیہ کا وظیفہ خوار قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ "امام زہری جنکو حدیث کا موجد کہنا چاہیے وہ بنی امیہ کے وظیفہ خوار تھے ان کو اقرار ہے کہ انہوں نے حدیثیں اس لیے وضع کیں کہ سلاطین نے ان سے ایسی خواہش کی" سچ ہے بقول سعدیؒ، ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیب است۔ یہ تحقیق انیق انگلینڈ کے ایک عربی پروفیسر سے ماخوذ ہے، جسکا دندان شکن جواب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ نے معارف سنہ ۲۶ء میں دیا ہے۔ ہم اسکی تلخیص افادۂ ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں "یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ امام زہری سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام ابن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم موصوف کے سپرد کی تھی۔ بیشک امام زہری کا یہ قول موجود ہے " اکرهنا علیه هؤلاء الامرآء یعنی "اس کام پر ہم کو امراء نے مجبور کیا" اب فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کام پر مجبور کیا؟ ضرورت ہے مشار الیہ کا بقیہ ٹکڑا بھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے۔ عن عبد الرزاق عن معمر عن الزهري قال كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الامرآء فرأينا ان لا يمنعه احد من المسلمين، (ابن سعد جزء ۲ قسم ثانی صفحہ ۱۳۵) - یعنی "عبدالرزاق معمر سے اور معمر زہری سے روایت کرتے ہیں کہ زہری کہتے ہیں کہ ہم لوگ علم حدیث کو لکھنا پسند نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ہمکو بادشاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ ہو)

(۱۰) فتنۂ خلق قرآن کے فرو ہو جانے کے بعد جب خلیفہ متوکل نے علماء سنت کو روایت حدیث کی عام پروانگی عنایت کی تو ایک محدث ابن ابی شیبہ کے گرد اول ہی مجلس میں تیس ۳۰ ہزار طالبان حدیث ..... پروانہ وار جمع ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن ابی شیبہ کے ہمسر بلکہ ان سے فائق تر ائمہ محدثین ملک میں موجود تھے۔ پھر جب ایک محدث کی پہلی مجلس میں اتنے طلبہ تھے تو دوسروں کے ہاں کسقدر ہونگے

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

(۱۱) امام ابو حاتم رازیؒ حدیث کی طلب میں ۹ ہزار میل سفر کرتے ہیں اور پھر شمار کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ابن المقریؒ نے ۵۴۰ میل اخذ حدیث میں سفر کیا۔ امام ابن طاہر مقدسیؒ حدیث کی تحصیل میں پیادہ پا چلتے یہانتک کہ پیشاب میں خون آجاتا۔ امام بخاریؒ کی زندگی میں امام موصوف سے ۹۰ نوے ہزار اشخاص نے بلا واسطہ بخاری شریف کو سنا۔ موطا امام مالکؒ کو امام عالی مقام کی زندگی میں ہزار آدمیوں نے سنکر جمع کیا۔ جب امام علی رضا رضی اللہ عنہ نیشاپور تشریف لیگئے تو آپ سے صرف ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۔ نے (یعنی خلفاء بنو امیہ نے) اس کے لکھنے پر مجبور کیا، اور اب ہماری رائے یہ ہے کہ کوئی مسلمان اب اسکو منع نہ کرے" یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبد البر (صفحہ ۳۶ مصر) تقیید العلم ابن جوزی اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے۔ اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ بعض علماء ابتدا میں حدیث کے لکھنے سے منع کرتے تھے اور بشدت اس سے پرہیز کرتے تھے۔ مگر سلاطین بنو امیہ نے زور دیا کہ احادیث کو ضبط تحریر میں لاکر محفوظ کر دیا جائے۔ آخر کار امام زہری کو بھی اس کی مصلحت معلوم ہوئی اور انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ غور کرو کہاں زہری کا یہ اقرار کہ احادیث کو کتابوں میں محفوظ کر دینے کی جو رائے سلاطین نے دی تھی اسے صائب پاکر ہم نے یہ کام انجام دیا اور کہاں اس قول کو یہ معنی پہنانا کہ سلاطین کے مجبور کرنے سے انہوں نے حدیثیں گھڑیں۔ اللہ اکبر

"ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا"

حدیث لینے کے لیے ۲۰ ہزار آدمی قلم دوات اور کاغذ لیے موجود تھے۔ شہر رقّہ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی تشریف آوری پر آپ کے اردگرد طالبین حدیث کے دل بادل جمع ہو گئے، اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں، اور اس منظر کو دیکھ کر خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے کہ سلطنت اس کو کہتے ہیں۔

ان واقعات پر غور کرو۔ کیا یہ محنتیں جو محدثین نے روایات جمع کرنے کے لیے کیں محض تاریخی ذوق کی بنا پر تھیں؟ کیا وہ مسلمان جو ہزاروں کی تعداد میں ایک ایک محدث کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے، ان کو محض تاریخ کا شوق کھینچ کر لے جاتا تھا؟ کیا وہ اہتمام جو صحابہ اور تابعینؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور ارشادات جمع کرنے کے لیے کیا وہ محض اس وجہ سے تھا کہ ذاتِ رسالت پناہی سے ان کو محض تاریخی دلچسپی تھی؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو ان واقعات کی کوئی توجیہ بجز اس کے نہیں کی جا سکتی کہ حدیث کے ساتھ علماء اور عام مسلمانوں کا شغف صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ سمجھتے تھے اور اپنی زندگیوں کو آپ کے طریقہ پر ڈھالنے کے لیے آپ کی زندگی کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اسی لیے انہوں نے آپ کی سیرت پاک کے صحیح و مستند حالات معلوم کرنے اور محفوظ کرنے کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو آج تک کسی تاریخی شخصیت کے لیے نہیں کی گئیں۔

الٰہی معجزہ یہاں پہنچ کر دیدۂ بینا رکھنے والے آدمی کو صاف نظر آجاتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور نزول قرآن کے ماحول اور قرآنی ہدایت کے ظہور کی پوری کیفیت کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کچھ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے کیا اسمیں دراصل وہی خدائی ہاتھ کام کر رہا تھا جس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ قرآن کو آخری ہدایت نامہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری نبی بنایا تھا، اور چونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ کتاب اور یہ نبی بنی نوع انسان کے لیے دائمی

ہدایت کا سرچشمہ بننے، اس لیے اس نے نہ صرف قرآن کی حفاظت کے لیے وہ انتظام کیا جو اُس سے پہلے اور اُسکے بعد دنیا کی کسی کتاب کے لیے نہیں ہوا، بلکہ ساتھ ہی اس نے ایسا انتظام بھی کردیا کہ وہ پورا دور جس میں قرآن نازل ہوا اور جس میں قرآن کے لانے والے نے ہدایت و ارشاد کی خدمت انجام دی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے تاکہ ہر زمانے کے لوگ دیکھ سکیں کہ قرآن کی تعلیم کا مقصد کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے، اور قرآنی اخلاق، قرآنی سیاست، قرآنی تمدن و تہذیب، قرآنی طرز زندگی کا نقشہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خدائی حکمت و قدرت کی نشانیوں میں سے ایک عظیم الشان نشانی ہے کہ آخری نبوت کے دور اور اس سے قریب کے زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو آئندہ نسلوں کے متعلق اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا، جنہوں نے نوع انسانی کے آخری رہنما کی زندگی کے ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ تک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کردینے کی کوشش کی، اور جنہوں نے اس خدمت کے انجام دینے میں اُس ذہانت، اُس محنت اور اُس تن دہی سے کام لیا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتنے ہی انبیاء گذر چکے ہیں۔ مگر آج کسی کی صحیح تاریخ پیدائش تک دنیا میں محفوظ نہیں ہے۔ حضور صلعم کے بعد کتنی ہی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو دنیا والوں نے عظمت کا درجہ دیا۔ لیکن ان میں سے کسی کے حالات بھی ایسے موثق ذرائع تحقیق کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں جو قوی احادیث تو درکنار ضعیف سے ضعیف احادیث کے مقابلہ میں بھی رکھے جاسکیں۔ پھر کیا اس کو الٰہی معجزہ کے سوا کچھ اور کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ انسانی میں صاحبِ قرآن کی شخصیت ہی ایسی شخصیت ہے، اور نزول قرآن کا دور ہی ایسا دور ہے جسکی ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک اس طرح محفوظ کر کے رکھ دی گئی ہیں جیسے کھوٹے سکّوں کے ڈھیر میں سے ایک کھرا سکّہ الگ نکال کر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس روشن ترین حقیقت کی قدر جن کے دل میں نہیں ہے اور جو اس آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود اپنی بدبختی کا ثبوت دیتے ہیں۔ (باقی)